NOVATEUR PUBLICATIONS
JournalNX- A Multidisciplinary Peer Reviewed Journal
ISSN No: 2581 - 4230
VOLUME 6, ISSUE 10, Oct. -2020

ایہام گوئی اور اردو شاعری

محمد راشد، ریسرچ اسکالر، کلکتہ یونیورسٹی

اردو شاعری میں ایہام گوئی کے اسباب ومحرکات پر بحث کرنے سے پہلے یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ ایہام کسے کہتے ہیں؟ دراصل ایہام ایک صنعت کا نام ہے۔ ایہام کا شمار محاسن کلام میں ہوتا ہے چنانچہ فن بدیع کی بیشتر کتابوں میں اس صنعت کا ذکر ملتا ہے۔ یہ عربی لفظ ہے جس کے معنی گمان اور غلطی کے ہیں۔ فن بدیع میں کی کتابوں میں اس لفظ کے لغوی معنی بھی دیئے ہوئے ہیں چنانچہ فارسی کی قدیم کتاب "حدائق اسحر فی دقائق الشعر" مؤلفہ رشید وطواط (متوفی 1177ء) میں ایہام کے معنی "بدگمان افگندن" بتائے گئے ہیں۔ فخری بن امیری نے (964ھ) "ضائع الحسن" میں ایہام کے لغوی معنی بھی بتائے ہیں اور اصلاحی بھی۔ یعنی شعر کی بنیاد کسی ایک لفظ پر ہو اور اس لفظ کے دو معنی ہوں ایک قریب، دوسرا بعید اور شاعر کی مراد بعید سے ہو۔

ایہام کی تعریف کے بعد اس کے اسباب ومحرکات پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ اس کے پیچھے بہت سارے اسباب ومحرکات ہو سکتے ہیں۔ جیسے سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی اور تہذیبی لیکن ان میں سیاسی اور سماجی محرکات اہم ہیں جسے تفصیل سے بیان کیا جا رہا ہے۔

کسی ملک کی تہذیب کے پیچھے سیاسی محرکات رونما ہوتے ہیں۔ سترہویں صدی اس تہذیب کا نقطۂ عروج ہے اور اٹھارہویں صدی اس عظیم سلطنت کا زوال کے اسباب ہیں۔ وہ نظامِ خیال جس نے اس عظیم سلطنت کو جنم دیا تھا اب وہ قوتِ عمل اور آگے بڑھنے، پھیلنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا تھا اور اس لئے تاج محل والی تہذیب کی دیوہیکل عمارت کے ستون ایک ایک کر کے گرنے لگے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات اس صدی کا پہلا اور سب سے اہم واقعہ ہے۔ جس کے بعد پچاس سال کے عرصے میں نا اہل جانشینوں کی بے طاقتی، خانہ جنگی، عیش پرستی، اماء کی باہمی آویزش، عسکری قوت کی کمزوری اور سلطنت کے وسیع تر مفاد میں اتحاد کے جذبے کا فقدان نے اس وسیع وعریض سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا۔ جب اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوئی جانشینی کی جنگ شروع ہو گئی اور بڑا بیٹا معظم کامیاب ہو کر بہادر شاہ کا لقب سے تخت پر بیٹھا۔ چار سال گزرے تھے کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بیٹوں میں لڑائی شروع ہوئی۔ اور اس کی لاش مہینوں تک ایسی ہی پڑی رہی۔ جہاں دار شاہ تخت پر بیٹھا۔ وہ شراب کا رسیا تھا۔ افیم کا عادی، عادات واطوار میں نہ شاہانہ وقار تھا نہ توازن، دن رات عیش پرستی میں رہتا۔ طوائفوں کا دربار میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ننگی ناچ ہوتی تھی۔ شراب وکباب چلا کرتا تھا۔ بادشاہ کے ساتھ ساتھ تمام امراء بھی اس میں ملوث رہتے تھے۔ اس کے بعد جتنے بھی بادشاہ آئے کم وبیش اسی طرح کے عادات واطوار رکھنے والے تھے۔ ان میں فرخ سیر بھی بہت عیش پرست بادشاہ گزرا ہے۔ یہ بہت ظالم بادشاہ تھا۔ اس نے بہت لوگوں کو قتل کرایا۔ ان میں ایک مشہور شاعر جعفر زٹلی بھی ہیں۔ اس کے خلاف جو بھی کہتا وہ اسے قتل کروا دیا کرتا تھا۔

اس کے بعد جو بادشاہ تخت وتاج پر بیٹھا ہے وہ رفیع الدولہ بہادر شاہ کے پوتے جہاں دار شاہ کا بیٹا روشن اختر ہے جسے محمد شاہ کے خطاب سے تختِ سلطنت پر تمکن کیا گیا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بارہ سال بعد یہ چھٹا بادشاہ تھا۔ محمد شاہ جو عرف عام میں محمد شاہ رنگیلا کے نام سے معروف تھا۔ 1748ء تک اس تخت پر بیٹھا رہا۔ اس کے دورِ حکومت میں ایوان ستون، ایک ایک کر کے گرتے گئے اور وہ اس زوال کو محض تماشائی بنا "غرقِ مے ناب" کرتا رہا۔ تقریباً تیس سال کے عرصے میں سارے برعظیم میں پھیلی ہوئی مغلیہ سلطنت بکھر گئی اس لیے اسے "خاتم السلاطین بابریہ" کہا جاتا ہے۔

محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں جتنے بھی امراء تھے وہ اس کے خلاف رہتے تھے۔محمد شاہ رنگیلا بہت رنگین مزاج تھا۔اس نے ایک بازاروعورت کو محل میں بٹھا دیا تھا۔وہ بہت عیش پرست بادشاہ گزرا ہے۔رات دن شراب نوشی اورعیش پرستی میں ملوث رہتا تھا۔جب اس نے بازارو عورت کومحل میں جگہ دی اس وجہ سے معاشرے میں اس کا اثر بہت گہرا ہوا۔اس وقت وہاں امرد پرستی اور جنسی رجحان عام ہوا۔رنگیلا خود شاعر تھا۔اس نے اپنے مزاج کے مطابق امرد پرستی کی شاعری کی۔عاشق ومعشوق کا زمانہ عنفوان شباب کا زمانہ ہوتا ہے۔اس کا اظہار بہت عریانیت اورفحاشیت کے ساتھ ابہام گوشعراء نے کیا ہے۔اس وقت تمام لوگوں کا ذہن جنسی تلذذ کا شکار ہوگیا۔اسی کے زمانے میں نادرشاہ نے دہلی پرحملہ کیا جب وہ حملہ کرنے والا تھا تومحمد شاہ کو یہ بات معلوم ہوچکی تھی۔اس وقت اس نے کہا تھا کہ دلّی ابھی بہت دور ہے۔اوروہ عیش گوشی میں مصروف رہا۔دیکھتے ہی دیکھتے نادرشاہ کی فوج دہلی میں داخل ہوئی۔اور ہرطرف قتل وخون کا بازارگرم کیا۔سارے معاشرے میں بےچینی اور بدحالی پھیل گئی۔نادرشاہ کے حملے نے پوری دہلی شہرکو برباد کردیا۔بہادرشاہ رنگیلا کے آخری ایّام میں احمد شاہ ابدالی بھی حملہ آورہوا۔اس نے بھی خوب تباہی مچائی،خوب لوٹا گھسوٹا،رہی سہی کسراس نے پوری کردی۔دلّی پوری طور پرٹوٹ چکی تھی۔

دلی کا حال بد سے بدتر ہوگیا۔یہاں کی سماجی زندگی،معاشی زندگی،اقتصادی زندگی سبھی خطرے میں پڑگئی۔سماج میں ہرطرف برائی پھیلنے لگی،معاشی حالت خراب ہوگئی،نظم ونسق کی حالت دگرگوں ہوگئی،نظم ونسق کی حالت دگرگوں ہوگئی۔سلطنت کا چراغ بجھتا ہوانظر آرہا تھا۔جس کے جی میں جوآرہا تھا وہ لوٹ رہا تھا۔سماجی سطح پر انسانوں میں دوہراپن آگیا تھا۔پورے معاشرے میں بناوٹی پن آگیا۔بڑے بڑے امراءاپنے کرتوتوں کوچھپانے کے لئے شرافت کا لبادہ اوڑھنے لگے۔ان لوگوں کا کہنا تھا کہ بے پردگی نہیں ہونی چاہئے یہ صرف ان کی ماؤں،بہنوں اور بیبیوں کے لئے تھا۔وہ سبھی دربار کے اندر رہتی تھیں لیکن عام عورتوں کے ساتھ یہ پردہ نہیں تھا۔
بڑے بڑے امراءجنسی تشنگی اور جنسی خواہش کے لئے بازاروعورت کواپنے محلوں میں دعوت دیتے اورننگی ناچ ہوتی تھی۔عیش پرستی اور جنسی تلذذ سبھی کے ذہن میں بیٹھا ہوا تھااس وجہ سے پورا معاشرہ اس رنگ میں رنگ گیا۔ہرطرف عریانیت اورفحاشیت بڑھنے لگی۔

ادب یا شاعری سماج کا آئینہ ہوا کرتا ہےاورشاعرسماج کا پروردہ۔تمام شعراءاسی ماحول میں جی رہے تھے۔چہارطرف دورنگی کا منظرنظر آرہا تھا۔اسی دورنگی کوشاعروں نے اپنی شاعری کے ذریعہ بے نقاب کیا۔۔تمام شاعرنے ساری فحاشی،بدنام معاشرے کواپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔اسی معاشرے سے متاثر ہوکرشاعروں نے ابہام گوئی کا رواج عام کیا۔انھوں نے اپنی شاعری میں معاشرے کی بدحالی کوابہام کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ ایک طرف مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ فارسی زبان بھی کمزور ہوتی گئی اوردوسری طرف نئی نسل کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہم کتنی بھی کوشش کریں ایرانیوں کے معیارِ فارسی تک نہیں پہنچ سکتے۔اس لئے مناسب یہ ہے کہ ریختہ کا آئین اپنایا جائے۔اس رجحان نے شمالی فضا کوایسا بدلا کہ اردوزبان وادب عوام وخواص کی معاشرت میں داخل ہوگئے۔لیکن اس رجحان کی پیدائش میں جہاں ان سب عوامل نے کام کیا وہیں دکنی ادب کی روایت نے بھی شمال کی ادبی روایت کے لئے مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔

اورنگ زیب عالمگیر کی فتح دکن کی بعد شمال وجنوب کے درمیان جودیوار کھڑی تھی وہ دور ہوگئی تھی اور یہ دونوں علاقے گھرآنگن ہو گئے تھے۔فارسی کے مشہورشاعر ناصرعلی دکن گئے تو وہ بھی دکنی اردو میں غزلیں کہنے لگے۔میر،جعفرزتلی کی شاعری کے زبان وبیان پر دکنی ادب کی روایت کا اثر نمایاں ہے،فائز،مبتلا آبرو،ناجی اوشاہ حاتم کے"دیوانِ قدیم" کی شاعری پر یہ اثرات نمایاں اورواضح ہیں،محمد شاہ کا دورآتے آتے ان اثرات کی آرجارکوتقریباًپون صدی کا عرصہ گزر چکا تھا کہ محمد شاہ کے دوسرے سال جلوس میں دیوانِ دلّی پہنچا۔یہ دیوان ریختہ میں تھااور فارسی روایت کے عین مطابق حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا تھا۔اس میں زبان تواردو تھی لیکن بندش وتراکیب استعارات وتشبیہات کا حسن،لفظوں کا جماؤاوراستعمال کرنے کا انداز،سادگی وتازہ گوئی،مضمون آفرینی اورابہام میں وہی دلکشی تھی جوفارسی شاعری کا طرۂ امتیاز تھی۔ولی کی غزل صرف عورتوں سے باتیں کرنے تک محدودنہیں تھی بلکہ اس میں فارسی غزل کی طرح صوفیانہ وحکیمانہ اور اخلاقی مضامین بھی باندھے گئے تھے۔اس میں غزل کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن بھی تھیں۔شمالی ہند کے شعراءکواس دیوان میں اپنی تخلیقی

،آرزوؤں اور اپنی شاعرانہ آدرش کا جلوہ نظر آیا۔اس دیوان نے ذرا سی دیر میں آگ سی لگا دی۔ ہر محفل میں اس کے چرچے ہونے لگے اور ہر جگہ ولی کے اشعار پڑھے جانے لگے۔قوال اور گویے بھی ولی کی غزل گانے لگے۔مصحفی نے شاہِ حاتم کے حوالے سے لکھا ہے کہ" فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) کے دوسرے سال جلوس میں دیوانِ ولی شاہجہاں آباد آیا اور اس کے اشعار چھوٹے بڑوں کی زبان پر جاری ہو گئے" مرزا محمد حسن قتیلنے بھی کلامِ ولی کی مقبولیت اور گلی کوچوں میں پڑھے جانے کی گواہی دی ہے۔

دیوانِ ولی نے شمالی ہند کی شاعری پر گہرا اثر ڈالا۔اور دکن کی طویل ادبی روایت شمال کی ادبی روایت کا حصہ بن گئی۔اٹھارہویں صدی شمال وجنوب کے ادبی وتہذیبی اثرات کے ساتھ جذب ہو کر ایک نئی عالمگیر روایت کی تشکیل وترویج کی صدی ہے۔اردو شاعری کی پہلی ادبی تحریک یعنی ایہام گوئی بھی دیوانِ ولی کے زیرِ اثر پروان چڑھی۔ولی نے اپنی شاعری میں ایہام کا استعمال کیا ہے۔جس کی مثال درج ذیل ہے:

اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں
عارضی میری زندگانی ہے

رخسار اور عارض دونوں کے معنی ہیں گال۔اس لئے عارضی لفظ سے ذہن عارض کی طرف جاتا ہے۔لیکن یہاں شاعر کی مراد عارضی سے غیر مستقل ہے۔

اس طرح کے بہت سے اشعار ولی کی دیوان میں موجود ہیں۔ان سب تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی عوامل نے مل کر اس صدی میں اردو کو وہ رواج دیا کہ صدی کے ختم ہونے تک یہ برعظیم کی سب سے ممتاز زبان بن گئی اور اس کا ادب نہ صرف دوسری علاقائی زبانوں کے لئے ایک نمونہ بن گیا بلکہ سارے برعظیم میں اس زبان میں ادب تخلیق ہونے لگا۔

ولی کا دیوان آنے سے شمالی ہندوستان میں اردو شاعری شروع ہوئی۔یہ کہنا کہاں تک درست ہے! ولی کی شاعری نے شمالی ہندوستان کی شاعری کو متاثر ضرور کیا لیکن اچانک پندرہ بیس سال میں اتنی بڑی تبدیلی لے آسکتی ہے۔یہ کوئی جادوئی چھڑی تو نہیں تھی۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ولی کے دیوان کے آنے سے پہلے وہاں پر ٹوٹی پھوٹی ریختہ کی شکل میں شاعری ہو رہی تھی۔ بلکہ اگر جعفر زٹلی کے کلام کو دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کی شاعری ہے۔اس سے قبل شمالی ہندوستان میں امیر خسرو نے ایک مصرع فارسی کا تو دوسرا مصرع دیوناگری میں کہا ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ شمالی ہندوستان میں اردو میں شاعری ہو رہی تھی۔لیکن کم کیوں کہ اس وقت وہاں کے شاعر فارسی میں شاعری کر رہے تھے۔ولی کا دیوان آنے کے بعد ریختہ کی طرف متوجہ ہوئے۔جو ریختہ نہ بھی کہنا چاہتے تھے ان شاعروں نے بھی ریختہ کی شکل میں شاعری کی۔

ایہام گوئی کے رواج کے سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہر ایسے دور میں جب محفلِ نشاط گرم ہو اور عیش ومستی کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہو، الفاظ کے پہلو دار استعمال کی طرف ذہن منتقل ہونے لگتا ہے۔اس کی دو وجہیں ہوتی ہیں: ایک اس وجہ سے کہ عشق و عاشق داخلی جذبہ کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی عیش ونشاط کا موضوع بن جاتی ہے اور' میلے ٹھیلوں، مجلسوں اور محفلوں میں بھی زیرِ بحث آتی ہے۔عشق کا بیاں رمز وکنایے میں مزہ دیتا ہے اور اس لئے پہلو دار الفاظ کا استعمال لامحالہ زیادہ ہونے لگتا ہے۔دوسرے اس وجہ سے کہ ایسے دور میں جب محفلیں آباد ہوں اور اجتماعی زندگی کا راگ رنگ ہر طرف بکھرا ہوا ہو، ضلع جگت اور دو معنی الفاظ سے پھبتی، کنایہ اور بدیہہ گوئی میں لطف پیدا ہو جاتا ہے۔عمدۃ الملک امیر خاں انجام اور برہان الملک کا جو لطیفہ" صاحب" مفتاح التواریخ نے نقل کیا ہے اس میں:

نواب آئے ہمارے بھاگ آئے

" بھاگ" دو معنوں میں استعمال ہوا ہے ایک خوش قسمتی دوسرا شکست کھا کر بھاگ آنے کے معنی میں۔

ایہام اور صنعت گری زبان کے سنِ بلوغ تک پہنچنے کے لئے پہلے کی منزل ہے جہاں الفاظ کی اہمیت اور معنوں قدر و قیمت کا احساس نمایاں ہونے لگتا ہے۔اور ناہمواری اور شتر گربگی کے بجائے ربطِ کلام اور مناسب الفاظ کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے۔اردو کی

نشوونما میں ایک ایسی منزل آئی جہاں اسے لسانی طور پر چھان پھٹک کی ضرورت محسوس ہوئی اور الفاظ کی مناسبت اور اور ان کے روابط اور متعلقات کا احساس بیدار ہوا۔اردو میں یہ ضرورت ایہام گوئی کے دور میں کسی حد تک پوری ہوئی اور اس کی تکمیل لکھنؤ کے دبستان، شاعری نے کی۔اس لئے ایہام گوئی کے رواج کے لئے محض ہندی ادب یا فارسی شاعری کے اثرات کو ذمہ دار قرار دینا صحیح نہ ہوگا بلکہ اس کی ترویج میں جہاں یہ دونوں اثرات کسی حد تک شریک تھے وہاں خود ریختہ کی نئی شاعری کا تقاضا یہ تھا کہ اس کا شعری اور لسانی پیکر تراشنے کے سلسلے میں الفاظ کی معنوی اور اضافی اہمیت کا احساس پیدا ہو۔اسی احساس کو اس دور کے مجلسی زندگی اور عشق و عاشق کے ہنگاموں نے تاریخی بنیادیں بخش دیں، اور شاعری صنعت گری کے چنگل میں پھنس گئی۔ان عوامل کو اردو شاعری کے پہلے دور کے ابہام گوئی ہونے کا سبب بتایا جا سکتا ہے۔

ایہام کے بارے میں مختلف لوگوں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ابہام کی مقبولیت کا ثبوت اس دور کے تمام شعراء کے کلام میں بھی ایہام کے نمونے مل جاتے ہیں جنھوں نے ایہام گوئی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا مثلاً حاتم، مرزا، مظہر، سودا، میر وغیرہ۔اس کے علاوہ ایہام گوئی کی مقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ محمد شاہی دور کی بیاضوں میں جو کلام جمع کیا گیا ہے اس میں بھی ابہام کی مثالیں زیادہ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جن شعراء نے ایہام گوئی کے ذریعہ شعریت اور تغزل کو مجروح کیا ہے ان میں آبرو، ناجی، مضمون بٹ اور حاتم اہم ہیں۔ان لوگوں نے ہی ایہام گوئی کی روایت کو عام کیا لیکن بعد میں حاتم اس سے الگ ہو گئے۔اور انھوں نے اپنے دیوان کو صاف ستھرا کیا۔اور اس کا نام "دیوانِ زادہ" رکھا۔لیکن اس سے قبل وہ بھی ایہام گوئی میں شاعری کیا کرتے تھے۔شاعری کی بے ساختگی اور جذبات نگاری کے راستے میں جب صنعت گری اور آراستگی حائل ہو جاتی ہے تو اس کی تاثیر اور لطافت میں کمی آجاتی ہے۔یا ذہن جذبے اور احساس کے بجائے الفاظ کے دروبست میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

ایہام گو شعراء نے الفاظ کے پیکر تراشنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ایک لفظ کی معنوی حیثیت میں کتنا تنوع ہو سکتا ہے۔وہ بیک وقت کتنے مفہوم ادا کر سکتا ہے اور کتنے پہلوؤں کو سمو سکتا ہے، محاورہ کا جزو بن کر کس طرح اس میں معنوی تبدیلی آجاتی ہے اور الفاظ کس طرح دوسرے الفاظ سے مربوط ہو کر اپنے معنی تبدیل کر سکتے ہیں، ان لطیف نکات کی طرف جس طرح ایہام گو شعراء توجہ کی اس سے قبل نہیں کی گئی تھی۔ایہام گو شاعر کے نزدیک لفظ گنجینہ معنی طلسم کی حیثیت رکھتا ہے جس سے مختلف آوازیں اور مختلف معنی پیدا ہوتے ہیں۔لفظیات کا نیا ادراک زبان اور ادب کے ابتدائی دور میں ایک بڑی خدمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ایہام گوئی کی چند مثالوں پر غور کرنے سے یہ بات اور بھی واضح ہو جائے گی:

یہ شعلہ عشق کا حسن ازل کا نور ہے گویا
جلا ہے جب سے سیناتب سے کوہِ طور ہے

آبروؔ، لفظ کا معنوی تنوع

نظر آتا نہیں وہ ماہ رو کیوں
گزرتا ہے مجھے یہ چاند خالی

مضمونؔ۔لفظ کے کئی پہلو

دیکھ تجھکو کہیں گے سب مورکھ
تم اپنی بات کے راجہ ہو پیارے

ناجیؔ۔لفظ کے کئی پہلو

آخری دونوں اشعار میں لفظ کے کئی پہلو سامنے آئے ہیں۔خالی کا لفظ بہ یک وقت تعبیر دیدار کے معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔اور ذی قعد کے معنوں میں بھی۔اسی طرح مورکھ ہندی میں بیوقوف کو کہتے ہیں۔اور موفارسی میں بال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس

طرح مورکھ کے معنی ہو سکتے ہیں کہ بال بڑھاؤ، اسی طرح سوائی زیادہ ہونے اور سوا ہونے کو کہتے ہیں۔

اور جے سنگھ سوائی جے پور کا مشہور راجہ تھا۔ان تین مثالوں کے تنوع پر غور کیجئے۔ایک میں لفظ لغوی معنی اور بول چال کے معروف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔اور مورکھ ذولسانین کی مثال ہے جس میں ایک معنی فارسی سے لئے گئے ہیں اور دوسرے ہندی سے۔تیسرے میں لفظ کے معنی اور تاریخی تلمیح کے تعلق کی بنا پر ایہام پیدا ہو گیا ہے۔

محاورہ کسی طرح الفاظ کے معنی کو بدل دیتا ہے۔اس کی مثالیں بھی ایہام گو شعراء کے ہاں کثرت سے ملتی ہیں۔

فلک نے جس کوں دیکھا جگ میں یکتا
کیا تیغِ ستم سے اوسکے تیئں دو
آبروؔ

کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھو جی ڈوب جاتا ہے
خوبوں کو جانتا تھا گرمی کریں گے مجھ سوں
مضمونؔ

کیا فردا کا وعدہ سرو قد نے
قیامت کا جو دن سنتے تھے کل ہے
ناجیؔ

بعض جگہ ایہام صرف الفاظ کی ظاہری شکل وصورت اور املا کی مدد سے پیدا ہو گیا ہے۔،مثلاً

نازک پنے پہ اپنے کرتے ہو تم غروری
موسی کمر سے اپنی فرعون ہو رہے ہو
آبرو

ربط الفاظ اور ترتیب کلام سے بھی ایہام پیدا کیا گیا ہے۔اور اس سلسلے میں اس دور کے شعراء نے مختلف ترکیبیں استعمال کی ہیں۔کہیں ترکیبِ کلام کسی ایک لفظ کی مناسبات سے عبارت ہے۔کبھی ایک شے یا تصور کو کسی چیز سے تشبیہ دی گئی ہے اور پھر اس تشبیہ کی مناسبت سے پوری تصویر مرتب کی گئی ہے۔اس طرح تشبیہ در تشبیہ اور استعارہ در استعارہ سے وہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے جسے لکھنؤ کے شعراء نے رعایتِ لفظی کی شکل میں کمال تک پہنچایا۔

ترتیبِ کلام کے لحاظ سے معنی میں تبدیلی:

خدا وندا اٹھا دے درمیان سین ہجر کے پردے
ہمارے دام میں صیاد کرلیا یا ہمیں پردے
آبرو

ریختہ اس کو ہوا جادو مرا
سبز جامے سے میرے من کو ہرا
بلند آواز سے گھڑیال کہتا ہے کہ اے غافل
کٹی یہ بھی گھڑی تجھ عمر سے اور تو نہین چیتا
ناجیؔ

صائب کے طرز میں ایک مصرعے میں دعویٰ اور دوسرے میں حسن تعلیل سے اس دعوے کا ثبوت پیش کرنے کا انداز بھی ایہام

گوئی کی ایک نمایاں خصوصیت ہے:

جسے ہو زیب ذاتی اوسکے تئیں ہے عیب آرائش
کرے ہے بدنماں البتہ حسنِ ماہ کو گہنا
آبرو

دیکھ ھم محبت کی دولت سے نہ رکھ چشمِ کرم
لبِ صدف کے تر ہیں ہر چند گوہر میں آب
ناجیؔ

گرفتاری سے اس سرکشی کو آزادی میں ہرگز
موے سے بھی نہ نکلے گا یہ طوق گردن اے قمری
مضمونؔ

فائز کا ذکر کئے بغیر ایہام گوئی کی تاریخ ادھوری رہ جائیگی۔انھوں نے بھی اپنی شاعری میں ایہام گوئی کا استعمال بہت زیادہ کیا ہے۔اس لئے یہ ایہام گو شاعر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔آبرو اور فائز میں یہ کہنا دشوار ہے کہ دونوں ہمعصروں میں کس کی غزلیں کس کے پیش نظر تھیں لیکن ظاہر ہے کہ آبرو ایہام گوئی کی تہ داری اور فنی پختگی کی بنا پر فائز کے مقابلے میں بہتر ہیں۔ایک شعر میں دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب معلوم ہوتے ہیں۔

جب سجیلے خرام کرتے ہیں
ہر طرف قتلِ عام کرتے ہیں
فائز

نازنیں جب خرام کرتے ہیں
تب قیامت کا کام کرتے ہیں
آبرو

فائز کے یہاں رعایت لفظی کا استعمال زیادہ ملتا ہے۔جیسے:

چودھواں اس چندر کا سال ہوا
جس میں بدرِ با کمال ہوا
فائز

وحشت اے آہوئے حرم مت کر
رام ہونا براں سوں رم مت کر
فائز

اس کے ساتھ ساتھ ایہام گوئی کی ایک اور تاریخی خدمت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے،ایہام اور رعایت لفظی کی وجہ سے اس دور کی شاعری میں بعض تاریخی تلمیحات،سماجی حوالے،لباس،میلے ٹھیلے،نشست و برخاست،عام گفتگو کے انداز،محاورے،عام روایتیں اور اصطلاحیں نظم ہوگئیں۔یوں تو تاریخ اور معاشرتی اصطلاحیں اور جھلکیاں بعد کے دوسرے شعراء کے کلام میں بھی ملتی ہے۔لیکن یہاں فرق یہ ہے کہ ایہام گوئی کی بدولت یہ حوالے اپنے دوسرے متعلقات اور مناسبات کے ساتھ آئے ہیں اور اس لئے زیادہ واضح ہوگئے ہیں۔

حاتم کا شروع میں ایہام گوئی کی طرف رجحان تھا لیکن جب اس صنعت کی خرابیوں کا اندازہ ہوا تو اپنے کلام کا انتخاب کر کے ایک

مختصر مجموعہ تیار کیا اور اسکا نام "دیوان زادہ" رکھا۔ انھوں نے اپنے کلام کو ایہام سے پاک کیا۔ ترکِ ایہام گوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

انعام اللہ خاں یقین وہ پہلا شخص ہیں جنھوں نے نئی شاعری کے رجحانات کو اردو شاعری میں اس طور پر برتا کہ دوسرے شعراء کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مستقبل اسی رنگِ سخن میں نظر آنے لگا۔

مصحفی نے لکھا ہے کہ:

"ایہام گویوں کے دور میں جس شخص نے صاف و پاکیزہ ریختہ کہا وہ یہ جوان تھا۔ اس کے بعد دوسروں نے اس کی پیروی کی جیسا کہ وہ خود کہتا ہے:

حق کو یقیں کے یارو برباد مت دو آخر
طرزیں سخن کے اس کی تم نے اڑیاں ہیں"

یقین کی غزل میں لطافت وشائستگی کے ساتھ ایک شگفتگی وشیرینی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ شاعری وصف وحسنِ محبوب تک محدود نہیں ہے بلکہ عشق کے تجربے کو بیان کر رہی ہے۔ یقین کی غزل میں فارسی غزل کی طرح اہتمام کے ساتھ بات کو سجا کر بیان کرنے کی کوشش کا پتہ چلتا ہے۔ الفاظ نہایت ہی سادہ ہیں جس سے شعر میں سادگی کا احساس ہوتا ہے

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
نرا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

ان کے اس شعر کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سادگیٔ بیان کی طرف مائل تھے۔

اس دور کے مزاج میں چونکہ غم والم کی لے، پسپائیت، بے یقینی اور گہری افسردگی کا اثر موجود تھا۔ اس لئے یہ اثر اس دور کے ادب میں بھی سرایت کئے ہوئے ہے۔ مضطرب، منتشر اور نڈھال معاشرے کی روح زخموں سے چور تھی۔ طوفان نے اسے ہر طرف سے گھیر کر زندگی اور موت کے فرق کو مٹا دیا تھا۔ میر اور درد کی آوازیں اس کیفیت کی ترجمان ہیں:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
(درد)

موت اِک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
(میر)

طوفانوں کی زد میں آیا ہوا یہ معاشرہ ایک ایسی منزل کی تلاش میں تھا۔ جہاں اُسے سکون میسر آسکے۔ تصوف نے اس دور کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ جس کی گود میں زخمی انسانیت نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ تصوف اس دور کی بھٹکی اور عرفانِ ذات کا راستہ دکھایا تھا۔ اسی طرح اس دور میں تصوّف نے زخمی روح کو امیّد کی روشنی دکھائی۔ اس دور میں تصوف نے بے عملی کا فلسفۂ حیات نہیں تھا۔ بلکہ بامعنی وبامقصد طور پر زندہ رہنے کا نیا حوصلہ دینے کا وسیلہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ غم والم کے ساتھ بے ثباتیِ دہر، فنا اور تصوف کے دوسرے نکات بھی شاعری کے عام موضوعات بن گئے۔ جنھیں میر اور سودا نے اس طور پر پیش کیا کہ ان کی آواز میں سب کی آواز شامل ہوگئی۔ میر نے سادہ گوئی کی طرف خاص توجہ کی۔ انھوں نے بیشتر اشعار سادہ کہے ہیں۔ انھوں نے دہلی کو اجڑتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انھیں جہاں کہیں بھی

کھلتے ہوئے پھولوں کے مناظر دیکھنے کو ملتے تھے وہاں انھیں اب خزاں کا موسم نظر آتا ہے۔دہلی پوری طور پر تباہ و برباد ہو چکی تھی۔انھوں نے اپنے خیال کو اس طرح پیش کیا ہے:

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

میر اپنی شاعری میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو عام بول چال کی زبان ہے جیسے:

پتہ پتہ بوٹا بوٹا' حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

میر کی شاعری میں سہل ممتنع کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے جو دیکھنے میں سادہ اور عام فہم ہوتا ہے لیکن اس میں گہرائی اور گیرائی دونوں کی کارفرمائی نمایاں ہوتی ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگۂ شیشہ گری کا

میرؔ کی شاعری نے سادہ گوئی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا جو بعد میں سرسید جیسی تحریک کے لئے راستہ ہموار ہوئے اور اس کے بعد سادہ گوئی کی لہر بیشتر ادیبوں اور شاعروں کے دلوں پر چھا گئی۔اور اس طرح سے سادہ گوئی کا رواج عام ہوا اور ابہام گوئی ہمیشگی کی نیند سو گئی۔

☆☆☆